

اردو افسانہ "بارہ گھنٹے" میں ترقی پسند مثالیت کی شکست و ریخت کا تجزیاتی مطالعہ

## An Analytical Study of the Disintegration of Progressive Idealism in the Urdu Short Story 'Barah Ghantay'

*Dr. Ghulam Farida*

Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad

[ghulamfarida89@gmail.com](mailto:ghulamfarida89@gmail.com)

### KEYWORDS

Khawaj Ahmad Abbas  
Progressive Writers  
Movement  
Barah Ghantay  
Deconstruction  
Marxist  
Feminism  
Revolutionary Ideas

### DATES

Received 15-10-2025

Accepted 01-11-2025

Published 31-12-2025

### QR CODE



### ABSTRACT

Khawaja Ahmad Abbas, a prominent figure of the Progressive Writers' Movement, examines class oppression, social reform, and psychological conflict in his short story "Barah Ghantay". The narrative centers on revolutionary Vijay Singh during his brief twelve-hour release, a period that exposes the tension between ideological commitment and human vulnerability. This temporary freedom becomes a critical space where personal emotions challenge rigid political ideals. Employing Deconstruction and Marxist Feminism as analytical frameworks, the study explores how the text reveals underlying contradictions related to time, power, and gender relations. Although the story appears to advocate progressive and revolutionary ideals, a closer reading uncovers unconscious reinforcements of patriarchal authority and emotional dependence. The portrayal of gender roles and psychological fragility complicates the narrative's ideological stance. Ultimately, "Barah Ghantay" reflects not only the struggle against social oppression but also the internal fractures and limitations inherent within progressive ideology itself.

<https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/169>

تلخیص:

خواجہ احمد عباس، جو ترقی پسند تحریک کے نمایاں نمائندہ ہیں، اپنے افسانے "بارہ گھنٹے" میں طبقاتی جبر، سماجی اصلاح اور انسانی نفسیاتی کشش کو موضوع بناتے ہیں۔ افسانہ انقلابی کرداروں کے سنگھ کی بارہ گھنٹوں کی عارضی رہائی کے گرد گھومتا ہے، جو نظریاتی وابستگی اور انسانی کمزوری کے درمیان تصادم کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ مختصر آزادی ذاتی جذبات اور سخت سیاسی نظریات کے درمیان تناؤ کو آشکار کرتی ہے۔ تشکیلی تحلیل (Deconstruction) اور مارکسی نسوانیت کو تحقیقی طریق کار کے طور پر بروئے کار لاتے ہوئے یہ مطالعہ متن میں وقت، طاقت اور صنفی تعلقات سے جڑی پوشیدہ تضادات کو واضح کرتا ہے۔ اگرچہ افسانہ بظاہر ترقی پسند اور انقلابی اقدار کی حمایت کرتا ہے تاہم گہرا مطالعہ پدر سری نظام کی غیر شعوری تقویت اور جذباتی کمزوریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یوں "بارہ گھنٹے" ترقی پسند نظریے کی داخلی شکست و ریخت اور اس کی حدود کو اجاگر کرتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کو اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب فلم ساز اور صحافی تھے، بلکہ اپنی کہانیوں کے ذریعے طبقاتی انصاف، سماجی اصلاح، اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے نظریات کی پرزور وکالت کرتے تھے۔ ان کے افسانوں میں نظریے کے ساتھ ساتھ انسان کی نفسیاتی اور جسمانی کمزوریاں، اس کے خواب، مایوسیاں اور خواہشات بھی پوری شدت سے بیان ہوتی ہیں۔ ان کے یہی رجحانات انہیں ترقی پسند تحریک کے دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کا فکری عمل بنیادی طور پر سماجی حقیقت پسندی پر مرکوز تھا، جس کا مقصد ادب کو انقلاب اور تبدیلی کے لیے ایک عملی ہتھیار بنانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مختصر کہانیوں میں نظاماتی جبر اور انسانی مصائب کو براہ راست موضوع بنایا گیا ہے۔ تاہم، ان کی یہ مثالی وابستگی بعض اوقات ان کے بیانے میں نظریاتی بوجھ کا سبب بنی، جس نے متن کے اندر ہی تنقیدی تضادات کو جنم دیا:

"خواجہ احمد عباس ہمارے افسانہ نگاروں میں اس لحاظ سے سب سے منفرد ہیں کہ انھیں گرد و پیش کی زندگی میں مختلف حیثیتوں سے جو اونچ نیچ دکھائی دیتی ہے اسے انھوں نے ہمیشہ ایک سیاسی اور مصلحانہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔" (1)

ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی محض فکری نہیں بلکہ تنظیمی اور عملی تھی۔ خواجہ احمد عباس نے تحریک کے منشور کو اپنے صحافتی کام، ادبی تخلیقات، اور بطور انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کے بانی رکن کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں میں سمو دیا۔ ان کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ادب کا حتمی مقصد جمالیاتی مسرت نہیں، بلکہ طبقاتی شعور کی بیداری اور ظالمانہ سماجی ساختوں کی تحلیل ہے۔ وہ پریم چند اور سجاد ظہیر کی وراثت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بات پر زور دیتے رہے کہ فنکار کا قلم خاموش تماشائی نہیں ہو سکتا۔ یہی نظریاتی گہری جڑیں ان کے افسانوں کو تحریک کے مثالی نمونے کے طور پر پیش کرتی ہیں، جس کی بنا پر ان کے کام کا تجربہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے اندرونی تضادات کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔

افسانہ "بارہ گھنٹے" خواجہ احمد عباس کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے نظریاتی وابستگی اور فنی کوششوں کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ جس میں ایک انقلابی کردار و بے سنگھ کے ذریعے نظریے اور انسان کے باہمی تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ و بے سنگھ ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنے سیاسی عقیدے اور عوامی نظریے کے لیے اپنی جوانی، جلی و نفسانی خواہشات اور جذبات قربان کر دیے ہیں۔ وہ سولہ برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے، اور جب اسے محض بارہ گھنٹوں کی رہائی نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنے ماضی اور حال کے درمیان ایک اذیت ناک خلا میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ان بارہ گھنٹوں میں قید کے بعد کی دنیا، عورت، خواہش اور خود اپنی شکستہ حالت اس پر مکشف ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اس محدود زمانی تناظر میں دراصل پورے ایک نظریاتی نظام کے زوال اور انسانی حقیقت کے انکشاف کو سمودیا ہے:

"بارہ گھنٹے ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ دہشت پسند پارٹی کا ہیرو و بے سنگھ صرف بارہ گھنٹے کے لیے آزاد ہو کر جیل سے رہا ہوتا ہے۔ صبح سے اسے پھر گرفتار ہونا ہے کیونکہ پولیس اس کو کسی بھی طرح آزاد نہیں رہنے دینا چاہتی۔ یہ بارہ گھنٹے و بے سنگھ کے لیے آزادی، مسرت اور سکون کا وقفہ ہے۔ سولہ برس اس نے تنہائی، ذلت، مایوسی اور مشقت میں گزارے ہیں جنہوں نے اس کی روح تک کو مجروح کر دیا ہے۔" (2)

افسانے کے عنوان میں زمانی تعین بیانے کے تشکیلی نظام پر ایک سخت قدغن عائد کرتا ہے۔ "بارہ گھنٹے" کا وقتی فریم متنازعہ طور پر، بیانے کی سب سے بڑی ساختیاتی جبریت کی تشکیل کرتا ہے۔ پس ساختیاتی نقطہ نظر سے، یہ وقتی جبر کا فلسفہ محض ایک جمالیاتی انتخاب کی نوعیت نہیں رکھتا، بلکہ یہ نظامی استحصال کی طویل مدتی اور گہری نوعیت کو غیر ارادی طور پر نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ بارہ گھنٹوں کی قید دراصل طبقاتی اور جنسی جبر کی دائمی نوعیت کو عارضی حل میں سمیٹ کر، اسے ایک فوری مسئلہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہ وقتی فریم بیانے پر تشکیلی جبریت مسلط کرتا ہے، جو اسے ٹھوس مادی تجربے کی بجائے سستے جذباتی حل کی طرف مائل کرتا ہے، جس سے زندگی بھر کے نظامی جبر کی اصلی پیچیدگی سکر کر فردی واقعہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک داخلی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف بیانیہ اجتماعی جدوجہد کی ضرورت پر اصرار کرتا ہے، لیکن اس کی شکل ایک فرار پسندانہ، فوری، اور غیر مستحکم حل کی حمایت کرتی ہے، جس سے وسیع سماجی و اقتصادی مسائل کی استحکامیت کمزور پڑ جاتی ہے۔

یہ ساختیاتی کمزوری کہانی کے موضوعاتی ثنائی تضادات میں ظاہر ہوتی ہے، جہاں ترقی پسند تھیم بظاہر مقصدیت کو برتری دیتا ہے، لیکن متن کا اسلوب غیر محسوس طریقے سے غیر فعالیت کی جانب مائل ہوتا ہے۔ پینا کی مقصدیت کو بیانیہ جلد ہی اجتماعی عمل کی بنیاد کے بجائے ایک منفرد استثنیٰ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس سے اس کا عمل ایک مثال بننے کی بجائے ایک عارضی واقعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مزید برآں، کہانی کا حل اکثر پینا کی ذاتی کوششوں سے نہیں نکلتا، بلکہ ایک مردانہ کردار کی مداخلت سے جنم لیتا ہے۔ یہ

مداخلت دکھاتی ہے کہ متن ابھی بھی پدر سری استناد کے ڈھانچے میں مقید ہے، جہاں عورت کی طاقت کو بھی مرد کی توثیق درکار ہوتی ہے۔

یہ کہانی نہ صرف وقت کی قید میں نظام اور جنس پر مبنی جبر کی عکاسی کرتی ہے، بلکہ اسے ترقی پسند تحریک کے مثالی بیانیے کے طور پر بھی دیکھا گیا جہاں ایک عام انسان (بینا) طبقاتی جکڑ بندیوں کے خلاف لڑتی ہے۔ یہ افسانہ ترقی پسند ادب کی اس کوشش کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ معاشرتی تلخی کو فوری اور سادہ حل کے ساتھ پیش کرے، تاکہ قاری میں امید اور عمل کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اس افسانے کو شروع ہی سے ناقدین کی طرف سے مختلف اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا:

"آزادی سے قبل جب یہ کہانی شائع ہوئی تھی تو ترقی پسند اور قدامت پسند دونوں حلقوں سے کڑی تنقید کا نشانہ بنی تھی۔ بنگال میں قحط کے المیہ پر 'ایک پائیلی چاول' جیسی حقیقت پسندانہ کہانی لکھنے والا عباس اچانک دو انقلابیوں کو جنسی تسکین کے تجربے سے ہمکنار کر رہا ہے۔ حقیقت میں سوشل ریلیزم کے نعروں کے دور میں یہ ایک جرات آزما تجربہ تھا اور اس میں عباس نے دو انقلابیوں کو دو انسانوں کے روپ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی انسانی نفسیات اور انسانی رشتوں کی ساری نزاکت، گرمی اور شدت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔" (3)

عبدالسلام عارف کی اس رائے کو سامنے رکھتے ہوئے متن کا عمیق مطالعہ کیا جائے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس افسانے میں پیش کی گئی ترقی پسندانہ مثالیت ہی اس کا سب سے بڑا علمی ضعف ہے۔ یعنی کہ افسانہ "بارہ گھنٹے" کا بیانیہ شعوری طور پر ترقی پسندانہ تبدیلی کی وکالت کرنے کے باوجود، لاشعوری سطح پر انہی پدر شاہی اور نظاماتی جمود کی توثیق کرتا ہے جن کی وہ تردید کر رہا ہے۔ افسانے کا مادی اور علامتی ماحول بھی اس کی نظریاتی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ پلیٹ فارم اور ٹرین بظاہر ترقی اور حرکت کی علامتیں ہیں جو ترقی پسند تحریک کے نظریے کے عین مطابق ہیں۔ تاہم، ردِ تشکیل کے ذریعے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ حرکت ایک سراب ہے جو دراصل جمود کی توثیق کرتی ہے۔ پلیٹ فارم پر پینا کی جدوجہد وقت کی قید میں ہے، اور ٹرینیں یا تو آ رہی ہیں یا جا رہی ہیں، لیکن نظاماتی جبر اسی جگہ پر مستحکم رہتا ہے۔ یعنی مادی ڈھانچہ (ٹرین) آزادی کا وعدہ کرتا ہے، لیکن ساختیاتی جبر (پلیٹ فارم) اسے مستقل انتظار اور غیر فعالیت پر مجبور کرتا ہے۔

اسی طرح، انقلابی فرد (و بے سنگھ) کا ٹائیز دیکھنے کا مطالبہ صرف تفریح کی خواہش نہیں ہے، بلکہ یہ نظریاتی ہٹ دھرمی سے ایک شعوری فرار ہے۔ ٹائیز، جو خود سرمایہ دارانہ ثقافت اور جموٹی امیدوں کا مرکز ہے، کی طرف مائل ہونا یہ دکھاتا ہے کہ جب حقیقی انقلاب کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو انقلابی فرد بھی فردیت پسندی اور عمومی ثقافتی قبولیت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہ عملی جدوجہد کا جذباتی متبادل ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ نظریہ، مادی حقیقت کا سامنا کرنے سے قاصر ہو کر، پاپولر کلچر کے سامنے ہار مان لیتا ہے:

"میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سینما" بچپن کی سادگی کے ساتھ وجے سنگھ نے کہا تھا۔ ہر انسان کی فطرت میں بچپن ہوتا ہے۔ اور انقلابی بھی تو آخر انسان ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ آج کی رات اس کے دل میں سینما دیکھنے کی یہ شدید آرزو پیدا ہو گئی۔ کیا معلوم ہے اب جو وہ جیل جائے تو پھر کبھی زندہ نہ نکلے۔ شاید سینما دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جائے۔" (4)

افسانے میں وجے سنگھ کا رونا اس کی نظریاتی شناخت کا ایک اور فوری اور تباہ کن انہدام ہے۔ مصنف نے جس وجے سنگھ کو سیاسی ثابت قدمی کی علامت کے طور پر پیش کیا تھا، جو کوڑے، پھانسی اور بھوک ہڑتال پر مسکراتا تھا، اس کا بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونا ایک گہری نظریاتی پسپائی کی علامت ہے۔ وجے سنگھ کا رونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ نظام کے ٹھوس جبر کا مقابلہ تو انقلاب نے کر لیا، لیکن انفرادی، جذباتی اور جنسی دباؤ کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ ثابت کرتی ہے کہ ترقی پسندی کا بیانیہ سیاسی مادیت سے جذباتی حساسیت کی طرف منحرف ہو چکا تھا۔ افسانے میں اس واقعے کے فوراً بعد، اختتام پر دو کمروں کا منظر اور ان کے درمیان کی تکنیکی تفصیلات اس شکست کو حتمی شکل دیتی ہیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ کمرے دراصل بیٹا کا اپنا گھر ہیں، اس کے باوجود، یہ حقیقت کہ چٹخنی صرف وجے سنگھ کے کمرے میں لگتی ہے:

"مگر دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا اس کی چٹخنی اس کی طرف لگتی تھی۔ جدھر وجے سنگھ کا پلنگ تھا۔ بیٹا نے کواڑ بھیڑتے ہوئے آواز دی "مہربانی کر کے چٹخنی لگا لیجیے گا" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور انتظار کرتی رہی کہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئے۔ ایک منٹ گزرا۔ دو منٹ۔ پانچ منٹ۔ دس منٹ اور بیٹا کو ایسا محسوس ہوا کہ جب تک چٹخنی بند نہ ہوگی، اُسے نیند نہ آئے گی مگر چٹخنی بند نہ ہوئی۔" (5)

اسی طرح بیٹا کی آخری حرکت یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں بھی وجے سنگھ کے کمرے میں جاتی ہے، تمام انقلابی دعوؤں کو پلٹ دیتی ہے۔ یہ منظر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وجے سنگھ (انقلابی فرد) ایک مہمان کے طور پر بیٹا کے ذاتی دائرے میں داخل ہو کر بھی حفاظت اور کنٹرول کا حق اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ بیٹا کا یہ عمل آزادی کی طرف آگے بڑھنا نہیں ہے، بلکہ پدر سری نظام کے مرکز کی طرف پیچھے ہٹنا ہے۔ یہ بیانیاتی خاموشی دراصل ترقی پسند مثالیت کی مکمل شکست ہے جو عورت کو حقیقی سیاسی عمل کی بجائے جنسی تحفظ کے دائرے میں مقید کر دیتی ہے۔

افسانے پر مارکسی تائینیت کا اطلاق یہ واضح کرتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی نظریاتی شکست اس لیے ہوئی کہ وہ بیٹا کے دہرے جبر کا مکمل احاطہ نہ کر سکی۔ بیٹا صرف ایک طبقاتی محنت کش نہیں ہے، بلکہ وہ ایک جنسی وجود بھی ہے جس کی محنت، مارکسی تائینیت کے تحت، دوہرے استحصال کا شکار ہے۔ یہ دہرا جبر اس وقت مزید نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام، پدر سری ساختوں سے گٹھ جوڑ کرتے ہوئے، عورت کی محنت کو دو طرح سے کنٹرول کرتا ہے۔ کہانی میں جنسیت کا غلبہ اس لیے ہوتا ہے کہ نظام عورت کی تولیدی محنت اور اس کی جنسی قدر کو سستے میں یا مفت میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ دوہرا جبر ترقی پسند تحریک کے لیے ایک ناقابل حل تضاد (Aporia) پیدا کرتا ہے۔ تحریک طبقاتی غلامی کو تو ختم کرنا چاہتی ہے، مگر وہ پدر سری ساختوں سے پیدا ہونے والی جنسی غلامی کو نظام کے ثانوی مسئلے یا صرف ایک ضمنی سماجی خرابی کے طور پر دیکھتی ہے۔ اس نظریاتی نااہلی کے نتیجے میں، بینا کی مکمل آزادی ناممکن ہو جاتی ہے۔ انقلابی جدوجہد کا یہ ناگزیر تضاد بیانیاتی سطح پر حل طلب رہ جاتا ہے، جس سے سیاسی عمل کی جگہ جذباتی اخلاقیات لے لیتی ہیں۔ ٹھوس انقلابی جدوجہد کو جذباتی پیچھا لوجی سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس طرح، مصنف لاشعوری طور پر ایک دفاعی طریقہ کار اختیار کرتا ہے جہاں وہ انقلاب کی ناممکنیت کا سامنا کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے تنقیدی آرا کو مد نظر رکھا جائے تو اس کے واقعات اور جذبات میں فطری روانی اور بہاؤ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

"کہانی میں واقعات اور جذبات کا تجزیہ اتنا فطری اور دور رس ہے کہ اس کا انجام کہانی کے آغاز اور ارتقا کا لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہانی بظاہر روایتی اور فیوڈل اخلاقی آدرشوں سے انحراف کی مثال ہے لیکن یہی کہانی ایک انقلابی اخلاقیات کا شرف نامہ ہے جو انسانی جذبات اور گہرے انسانی رشتوں کے احترام کو مقدس جانتی ہے۔" (6)

تاہم اسلوبیاتی سطح پر، متن کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ لسانی عدم استحکام نمایاں ہے۔ تخلیقی دیانتداری پر جب سیاسی ارادے حاوی ہوتے ہیں تو ادب کلیشے کا شکار ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند ادیب کا مقصد چونکہ نظریاتی پرچار ہوتا ہے، اس لیے وہ کہانی میں اصطلاحاتی جمود اور مخصوص جملوں پر انحصار کرتا ہے۔ یہ رویہ ایک نظریاتی شارٹ سرکٹ کا کام کرتا ہے جہاں بیانیہ حقیقت کی درست نمائندگی کی بجائے پہلے سے تیار شدہ نظریاتی استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ اسلوب حقیقت کی پیچیدگی کو نظر انداز کر کے اسے سیاسی آسان کاری کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ یوں، کہانی کا اسلوبیاتی ڈھانچہ غیر ارادی طور پر اس خیال کی توثیق کر دیتا ہے کہ سماجی مسائل کا حل اتنا ہی سادہ ہے جتنا کہ ان کا بیانیہ۔

اس اسلوبیاتی کمزوری کا دوسرا پہلو جذباتی لفاظی میں ظاہر ہوتا ہے۔ بیانیہ کی آواز شدت کے لمحات میں ضرورت سے زیادہ لفاظی اور جذباتی ہو جاتی ہے، جو دراصل اس کے نظریاتی عدم استحکام کی علامت ہے۔ مصنف جہاں نظامی جبر کا ٹھوس ماڈی تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا ہے، وہاں وہ قارئین کے جذبات کو متحرک کرنے کے لیے متاثر کن اور مبالغہ آمیز زبان کا سہارا لیتا ہے۔ یہ جذباتی زبان دراصل ایک تخلیقی ہیرا پھیری ہے جسے کہانی کی نظامی تنقید پیش کرنے کی نااہلی کو چھپانے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس طرح، افسانوی زبان حقیقت کی عکاسی کرنے کے بجائے مثالی اور جذباتی تاثر پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے جو بالآخر ترقی پسند نظریہ کی بنیاد جو مادیت اور عملیت پر قائم ہے کو کمزور کرتی ہے۔ یہ تمام نقائص متن کے حتمی ناقابل حل تضاد یعنی فیصلہ پذیری کے مقام پر تعطل میں مرکوز ہوتے ہیں جہاں متن ایک ہی وقت میں اپنے مرکزی خیال کی تصدیق اور تردید کرتا ہے۔ ترقی پسند مثالیہ تبدیلی کا وعدہ ہے، جبکہ متنی حقیقت جمود کی تصدیق ہے۔

اس تنقید سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کا افسانہ "بارہ گھنٹے" دراصل ترقی پسند مثالیت کے بیانیہ کی ناکامی کا ایک غیر ارادی دستاویزی ثبوت ہے۔ کہانی میں وقتی جبر (بارہ گھنٹے) سے لے کر مادی علامات (پلیٹ فارم / ٹرین) تک، متن شعوری طور پر تبدیلی کا وعدہ کرتے ہوئے بھی ساختیاتی جمود کی توثیق کرتا رہا۔ اسی طرح انقلابی فرد (وہے سنگھ) کا بچوں کی طرح روپڑنا سیاسی مادیت کے انہدام اور جذباتی پسپائی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شکست کو اختتامی منظر نے حتمی شکل دی، جہاں بیٹا کا اپنے ہی گھر میں مردانہ چٹختی والے کمرے کی طرف جانا، آزادی کی نہیں بلکہ پدر شاہی اقتدار کے دائرے میں خاموشی سے داخل ہونے کی علامت بن گیا۔ لہذا، افسانے کی علمی قدر اس میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کہا، بلکہ اس میں ہے کہ یہ انقلابی نیت کے باوجود اپنے عہد کی ناقابل تسخیر سماجی حقیقتوں (طبقاتی اور جنسی جبر) کو حل کرنے میں کس طرح ناکام رہا۔ "بارہ گھنٹے" اس طرح ترقی پسند تحریک کی مثالیت کی شکست و ریخت کا ایک طاقتور مظہر بن کر ابھرتا ہے۔

### حوالہ جات

1. وقار عظیم، نیا افسانہ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1982ء)، 237۔
2. خالد اشرف، ہندوستانی ادب کے معمار خواجہ احمد عباس (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 2014ء)، 55۔
3. عبدالسلام عارف، خواجہ احمد عباس بحیثیت افسانہ نگار (دہلی: بک کارپوریشن، 2015ء)، 137-138۔
4. رام لعل (مرتب) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (نئی دہلی: سیمانت پراکاشن، 1988ء)، 189۔
5. ایضاً، 191۔
6. قمر رئیس، پروفیسر، خواجہ احمد عباس، سردی گرمی، مضمولہ مجموعہ نیلی ساری نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، 1983ء)، 44۔

### References in Roman Script

1. Waqar Azeem, *Naya Afsana* (Aligarh: Educational Book House, 1982), 237.
2. Khalid Ashraf, *Hindustani Adab ke Mi'maar Khwaja Ahmad Abbas* (Nai Dilli: Sahitya Akademi, 2014), 55.
3. Abdus Salam Arif, *Khwaja Ahmad Abbas ba haisiyat Afsana Nigar* (Dilli: Book Corporation, 2015), 137-138.
4. Ram Lal (Murattib), *Khwaja Ahmad Abbas ke Muntakhab Afsanay* (Nai Dilli: Seemant Prakashan, 1988), 189.
5. Aizan, 191.
6. Qamar Rais, Professor, "Khwaja Ahmad Abbas, Sardi Garmi," *mashmoola Majmua Neeli Saari* (Nai Dilli: Maktaba Jamia, 1983), 44.